# اُردو ناول پر سانحۂ مشرقی پاکستان (۱۹۷۱ء) کے اثرات:
# ۲۰۰۰ء تا حال

**محمد رویس، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان**

**ڈاکٹر محمد خاور نوازش، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان**

**Abstract:**

This article examines how 21st-century Urdu novelists – including Sohail Parwaz, Hameed Shahid, Aqila Saleem, Bashir Ahmed, and Khalid Fateh Muhammad – deploy innovative narrative techniques (fragmented timelines, multiple voices, symbolic landscapes) to confront the unresolved trauma of the 1971 East Pakistan Tragedy (Fall of Dhaka). Their narratives critically engage with the brutal military conflict between the Pakistan Army and the Mukti Bahini, alongside the potent Bengali freedom movement, which culminated in Dhaka's fall. Moving beyond historical chronicle, their fiction interrogates the deep psychological scars, collective guilt, and identity crises stemming from these events. These novels serve as vital spaces for challenging dominant narratives, exposing suppressed historical truths, and processing the nation's enduring sociopolitical wounds. Through their work, the authors reveal how 1971 continues to fracture Pakistani consciousness and provoke urgent reflection on state violence, historical accountability, and the precarious nature of nationhood across the subcontinent.

Key Words: Fiction, Urdu Novel, East Pakistan Tragedy, 1971, Fall of Dhaka, Political History

**کلیدی الفاظ:** فکشن، اردو ناول، سانحۂ مشرقی پاکستان، ۱۹۷۱ء، سقوطِ ڈھاکہ، سیاسی تاریخ

قیام پاکستان (1947ء) سے لے کر تا حال اردو ناول نے بہت سی کروٹیں لیں، قیامِ پاکستان کی یہی صورتحال اردو ناول کے ساتھ بھی ہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد جہاں افسانہ نگاروں، شعراء کرام اور ناول نگاروں کو تقسیم اور ہجرت کا موضوع مل گیا، وہیں انہوں نے اس تقسیم کے زیر اثر تجربات اور سانحات کو اپنے فن پاروں کا موضوع بنایا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک مختلف موضوعات پر اردو ناول کے ذریعے پیشکش کی جاتی رہی۔ شوکت صدیقی سے لے کر انتظار حسین تک ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے اندر تجربات کو خوبصورتی سے سمویا۔ ۱۹۷۱ء کا سانحہ مشرقی پاکستان تقسیم ہندوستان کے بعد دوسرا بڑا سانحہ تھا۔ پاکستان کی قومی تاریخ کے اندر ایک بہت بڑا سانحہ قرار پایا۔ سقوط مشرقی پاکستان سے نہ صرف مغربی پاکستان کے لوگ متاثر ہوئے بلکہ مشرقی پاکستان کے لوگ بھی اس سانحہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان لوگوں کی قومی سیاسی معاشی معاشرتی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دکھ والم کی قرب ناک تصویر سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ پاکستانی اردو ناول کے حوالے سے رفاقت حیات لکھتے ہیں:

> ”پاکستانی اردو ناول نے ابتدا کی دو تین دہائیوں میں اپنی حیثیت کو خاصاً مستحکم کر لیا اور اس کا دامن متنوع قسم کے ناول نگاروں سے بھرا رہا۔ لیکن یہ وہی زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کی یک رنگی حقیقت پسندی کے مقابل

جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ جس نے اردو شاعری سے آگے نکل کر اردو ناول کو بھی متاثر کیا۔ آگے چل کر سقوط ڈھاکہ جیسا دل خراش واقعہ پیش آیا تو وہ بھی ایک اہم ادبی موضوع بنا"۔(۱)

اُردو ادب میں ہجرت اور فسادات کو کافی کھل کر لکھا گیا۔ آمریت کے خلاف بھی لکھا گیا۔ سیاست دانوں کی عوام کے حق پر کی جانے والی لوٹ مار پر بھی لکھا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں سقوط ڈھاکہ ایسا سانحہ تھا، جس نے ہر طبقہ فکر کو سوچنے پر مجبور کیا۔ لوگوں کو بلا تخصیص قتل کیا گیا۔ ان کا سیاسی سماجی اور معاشی قتل عام کیا گیا۔ اردو ادب کے اندر نہ صرف شاعر حضرات بلکہ ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں نے بھی اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ اس بارے میں سلیم آغا قزلباش بیان کرتے ہیں:

"دوسری پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء کے بعد اردو ادب میں ارضِ وطن سے محبت کرنے والے میلان کو تقویت ملی۔ بلکہ اردو ادب کے اندر عرضی ثقافتی رجحان کا روپ اختیار کر لیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس کے نتیجے میں سقوط ڈھاکہ کا سانحہ خصوصاً اردو افسانہ نگاروں کے لیے ایک انتہائی جذبے سے کم نہ تھا۔ اس واقعہ نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو ذہنی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔"(۲)

اُردو افسانے کے علاوہ اردو ناول پر بھی سقوط ڈھاکہ کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ ناول نگاروں نے جہاں عالمی طاقتوں کے کردار پر سوال اٹھائے ہیں، وہیں انہوں نے ہندوستان اور ہندوؤں کے رویے پر بھی کافی گہری نگاہ ڈالی ہے۔ اس سارے کھیل میں کن کا کردار کیا رہا ؟ مسلمانوں کے خواب کیسے چکنا چور ہو گئے ؟ ان کا دو قومی نظریہ کیسے اور کیوں کر ٹوٹا ؟ یہ وہ سوالات ہیں جو کہ ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے کرداروں کے ذریعے سے اٹھائے ہیں۔ اردو ادب کے اندر ادیبوں نے اپنے طور پر تقسیم ہندوستان کے بعد کے مسائل سے لے کر سقوط مشرقی پاکستان کے بعد کے مسائل کا ذکر بخوبی احسن انداز میں کیا ہے۔ ظاہری سی بات ہے ان واقعات و سانحات سے ادب بھی متاثر ہوا اور ادیبوں کی پیشکش سے ان اصرار ور موز سے پردہ اٹھایا گیا جو کہ گمنام تھے۔

ناول ہی وہ واحد صنف ہے کہ جس میں سارے منظر نامے کھل کر بیان کیے گئے۔ اگرچہ تاریخی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اور کرداروں کی زبان کے ذریعے سے تاریخ رقم کی گئی اس لیے تاریخی پیشکش بہتر انداز میں کی گئی ناول کے ذریعے سے بہترین پیشکش کی جا سکتی ہے اور ناول نگاروں نے اس کو خوبصورتی سے پیش کیا۔ چاہے پھر وہ تقسیم ہندوستان ہو یا پھر سقوط مشرقی پاکستان ہو۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی نے ناول کے بارے میں فرمایا:

"ناول کے فلسفیانہ پہلوؤں پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ناول ایک زندہ اور ذی روح شے ہے۔ یہ زندگی کی تفسیر ہی نہیں بلکہ تصویر بھی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میں زندگی کی تمام حقیقتوں کی سچائی ایک ایسے انداز میں بیان کی گئی ہے جس نے ان کی سچائیوں کی عمومیت کو اپنے اندر جذب کر لیا ہوتا ہے۔ اپنی وسعت، گہرائی ، تنظیم اور تفسیرِ حیات کی کوششوں کے ساتھ یہ اس عظمت کا مستحق ہے جو اس کو حاصل ہے۔"(۳)

ناول زندگی کی پرتیں کھولتا ہے۔ داخلی اور خارجی دونوں انداز سے زندگی کو دیکھتا ہے۔ یہی چیز قیام پاکستان کے بعد کے ناول میں نظر آتی ہے۔ ناول نگاروں نے مسلمانوں کی ہجرت، بے سر و سامانی اور دیگر المیاتی حادثات کو اپنے ناولوں کے موضوعات میں جگہ دی۔ سقوط ڈھاکہ بھی پاکستانی تاریخ کا ایک علمناک پہلو ہے، جس کو ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے موضوعات کا حصہ بنایا، یہ ایک ایسا تخلیقی سرمایہ ہے، جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کر رہی ہیں۔ حقائق کھل کر سامنے آرہے ہیں، سوالات اٹھائے جا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر دیگر ممالک کے ناپاک عزائم کا پردہ چاک ہوا ہے۔ آج کی نسل کو اپنی تاریخ کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا ہے۔ وہ حقائق کو جان پائے ہیں۔ ناول نگاروں نے داخلی طور پر تمام گوشوں کو بے نقاب کیا ہے سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں افضال بٹ لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد ادب کہیں انسان کی انسان پر درندگی کی داستان رقم کرنے لگا تو کہیں مکتی باہنی کے ظلم وستم کی منہ بولتی تصویریں پیش کرنے لگا۔ اس طرح سے ۷۰ء کی دہائی میں اردو فکشن کے موضوعات میں افسانہ ہو گیا۔"(۴)

۲۰۰۰ء کے بعد پاکستان اور دنیا بھر کے اردو ناول نگاروں نے ایک نئے انداز میں اس واقعہ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حقائق کو اپنے ناولوں کے پیش کردہ کرداروں کے ذریعے سے عیاں کرنے کی کوشش کی۔ ان ناول نگاروں میں تارڑ، خالد فتح محمد، سہیل پرواز، حمید شاہد، کیپٹن بشیر احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے اندر مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان جغرافیائی معاشرتی و معاشی تفاوت کو موضوع بنایا۔ بنگالیوں کی مغربی پاکستان کے لوگوں اور خاص طور پر وردی والوں سے نفرت کو معاشرتی حقائق کی مدد سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اکیسویں صدی کا منظر نامہ اپنے اندر کافی تبدیلیاں سموئے ہوئے تھا۔

مُستنصر حسین تارڑ اکیسویں صدی کے بے حد مقبول ادیب، سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کے آج تک کافی سفر نامے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مگر ان کو شہرت ان کے ناولوں کی وجہ سے ملی ہے۔ انہوں نے اپنی ناولوں کے اندر ماضی اور حال کو یکجا کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی مثال ان کے ناولوں راکھ، بہاؤ، خس و خاشاک زمانے سے ملتی ہے۔ سفر ناموں سے زیادہ ان کی ادبی قدر و قیمت ان کے ناولوں کے حوالے سے ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد سفیر اعوان رقمطراز ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ ایک ایسے پاکستانی مصنف ہیں جو میڈیا اور ایکڈیمیا میں یکساں شہرت رکھتے ہیں۔ نگری نگری گھومنے والا سفر نامہ نگار، ڈرامہ نگار، ٹی وی میزبان اور کالم نگار کی حیثیت سے ان کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ اہم علمی حلقوں کے لیے ان کے ناول ہی ان کے ڈھیر سارے تخلیقی کام کا مظہر ہیں۔"(۵)

تارڑ نے اپنے ناولوں میں جہاں تقسیم ہندوستان کو پیش کیا ہے، وہیں ان کے شاہکار ناول راکھ کے اندر سقوط ڈھاکہ کا ذکر بھی سامنے آتا ہے۔ تقسیم ہندوستان سے شروع ہونے والے ناول میں کہانی جب آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے تو تارڑ اپنے مخصوص اسلوب سے آہستہ آہستہ ماضی کی گم گشتہ حقائق کو منصفہ شہود پر لاتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ اور اس کے تناظر میں نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی حقائق کو مشاہد کے کردار کے ذریعے سے سامنے لاتے ہیں۔ معاشرتی اور تہذیبی و لسانی انتشار کو موضوع بناتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ہولناک اثرات ان کے ناول کے کرداروں کی نفسیات پر غالب نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے سے تارڑ نے بتایا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کی شناخت ایک ہی ہے، چاہے وہ الگ ہی کیوں نہ ہو۔ شوبھا کے کردار کے ذریعے سے بنگالی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اٹھنے والی چنگاری کرید کر اس سانحہ کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایسی تاریخ کہ جس میں ہر طرف زخمی ہونے والے اور شکار ہونے والے اپنے ہی لوگ تھے۔ ظالم تاریخ کے اوراق میں آج بھی یہ بات نقش ہے جب ایک بھرے مجمعے میں یہ بات برملا کہہ دی گئی تھی۔

"وہ سامنے تاریخ کا کراس روڈ ہے۔۔۔۔۔۔۔ کدھر جانا ہے

ادھر ہم، ادھر تم

فاصلوں کی کمند سے آزاد"(۶)

مردان نے اس تہذیبی شناخت کو اپنی بیٹی شوبھا کے کے ذریعے سے زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جو کہ اب پاکستانیوں اور یہاں کے رہنے والے پنجابیوں کو اپنا دشمن گردانتے ہیں۔ مردان نے اپنے ان گناہوں کو دھونے کی کوشش کی ہے۔ جو مشرقی پاکستان میں انجانے میں اس سے سرزد ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے اس کو دن کے وقت بھیانک خواب آتے ہیں۔ جب اس کی فوج کے لوگ مکتی باہنیوں کی بجائے عام معصوم

شہریوں کو مار رہے تھے۔ ان کا قصور صرف اور صرف یہ تھا کہ وہ نہ تو اردو بول سکتے تھے اور نہ ہی سمجھ سکتے تھے۔ اردو ان کے اوپر مسلط کر دی گئی تھی۔ ان کی لسانی شناخت کو بالکل ویسے ختم کیا جارہا تھا جیسے انگریزوں نے فارسی کو ختم کیا تھا۔ یہ لسانی شناخت کا بحران تھا۔جب اقلیتی زبان کے لوگوں نے اکثریت پر زبردستی قومی زبان کا درجہ دے دیا۔ تارڑ نے اپنے ناول کے اندر بنگالی، لسانی و ثقافتی شناخت کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناریل کے تیل کی مہک، ساڑھی کا لباس، پام کے درختوں کی دھیمی دھیمی ہوا، ابلے ہوئے چاول یہ سب بنگالی ثقافت کی مثالیں ہیں۔ شوبھا کے کردار کے ذریعے سے مردان ان چیزوں کو محسوس کرتا، اسے ناریل کا تیل بالوں میں لگانے کے لیے دیتا، اسے چاول ابال کر کھلاتا، اسے ساڑھی پہننے کے لیے مجبور کرتا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ ملک کی تقسیم میں فوج کا بھی ہاتھ ہے۔ فوج اگرچہ ان حقائق کو بیان کرنے سے قاصر رہی ہے۔ مگر تارڑ نے مردان کے کردار کے ذریعے سے اس سانحہ کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ کیونکہ تاریخ کے گھاؤ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ مردان برگیتا سے مخاطب ہو کر اس فلسفہ کو بیان کرتا ہے:

> ”آپ کو سمجھنے میں دشواری ہوگی جن کی تاریخ میں گھاؤ ہوتے ہیں صرف وہی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ سمجھنا چاہیں تو اسے حق حاصل ہے"۔
>
> لباس کا۔۔۔۔۔۔خوراک کا۔۔۔۔۔۔اور زبان کا۔۔۔۔۔میری بنگالی بہت بری ہے۔ اور اسے بنگالی آتی بھی نہیں ۔مگر اس کے باوجود کوشش کرتا ہوں ۔لیکن تاریخ کے گھاؤ میں جتنی نفرت ہے۔ کیا میرا گھاؤ اتنا شدید نہیں۔۔۔۔۔“(۰۷)

تاریخ کے اس جبر میں گھاؤ ہی گھاؤ ہیں۔ گھاؤ دینے والے بھی اپنے گھاؤ کھانے والے بھی اپنے فائدہ تیسری طاقت کو ہوا۔ بھارت نے مکتی باہنی اور قوم پرستوں کو فائدہ حاصل کرنے کے لیے وسائل دیے، تربیتی کیمپ لگائے گئے، صرف اور صرف ۱۹۴۷ء کی تقسیم کا بدلہ لینے کے لیے ہم دولخت ہو گئے۔ اس جنگ میں کئی معصوم لوگ مارے گئے۔ کئی ہزار فوجی مارے گئے، قیدی بن گئے، تارڑ نے اپنے ناول میں اس سانحے کو خوبصورتی سے تلخ باتوں اور حقائق کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:

> ”جی ہاں قتل قتل کو جنم دیتا ہے تاریخ کے اختتام تک اور ہمیشہ انصاف کے نام پر انصاف جو انسانی تاریخ کا سب سے مہلک اور سب سے پر فریب لفظ ہے۔“(۸)

مردان، عارفین، نازنین اور شوبھا اس ناول کے اندر بنگالی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شوبھا بنگالی تہذیب و ثقافت عارفین اور نازنین ان عورتوں کی نمائندہ ہیں، جن کو ۱۹۷۱ء میں فوج کی وردی پہنے سپاہیوں نے نوچا۔ مردان انہی فوجیوں کا کپتان تھا، مگر سب سے الگ تھلگ۔ تارڑ نے اپنے ناول کے اندر اس سانحے کے زیر اثر آنے والے اثرات کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں محمد حمید شاہد کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" بھی قابل ذکر ناول ہے۔ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں سے اس ناول کے اندر وطن سے محبت، مٹی کا قرض اور سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ناول نگار نے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سیاسی اور سماجی مسائل اپنی جگہ لوگوں کی نفسیات اور اس سانحے کے کافی سنجیدہ مسائل سامنے آئے۔

"مٹی آدم کھاتی ہے" بھی ایسا ناول ہے جس کے اندر کہانی دو کرداروں کے ذریعے سے آگے بڑھی ہے۔ ایک راوی نہیں بلکہ تین تین راوی ہیں۔ کثیر کرداری ناول کے اندر مشرقی اور مغربی پاکستان کی برابر کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کے کرداروں میں شہروز، بڑے خان جی، کپتان سلیم، منیبہ، زرجان، خرم، میجر جلیل، پہلا راوی، دوسرا راوی شامل ہیں۔ ناول کے پہلے حصے میں مٹی کی محبت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کا دوسرا حصہ پڑھنے کے قابل ہے۔ جب سانحہ مشرقی پاکستان رونما ہو چکا ہوتا ہے۔ کردار نفسیاتی و ارضیاتی کشمکش کا شکار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر سلیم کی

شادی جب زر جان سے ہوتی ہے تو نفسیاتی عوارض کا شکار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیپٹن سلیم اس شادی سے خوش نہیں ہوتا ہے۔ اس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوتی ہے۔ جہاں وہ منیبہ سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ مگر اس کا شوہر جلیل مکتی باہنیوں کا اعلی کار بن جاتا ہے۔ اس حصہ میں وطن سے محبت اور مٹی کے قرض کی بات کی گئی ہے۔ وہ جنگ کے بعد اپنے ساتھ منیبہ کو بھی لانا چاہتا ہے۔ مگر ایسا نہ کر سکتا ہے۔ اس کے ذہن و دماغ پر ہر طرف منیبہ چھائی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ بظاہر تو مٹی کو اپنے ہاتھوں سے بار بار کھرچتا ہے مگر اس کام کے دوران وہ الفاظ بھی دہراتا ہے جو کہ اس کے نفسیاتی عارضہ کی عکاسی کرتے ہیں۔

"مٹی تو مٹی ہے۔
مٹی تو خاکی ہے، بس خاک اڑی ہے۔
مٹی تو مٹی ہے، اپنی کہاں رہتی ہے۔
زمین اور عورت جس کے پاس ہوتی ہیں، یہ اس کی وفادار ہوتی ہے۔
وہ کبھی کبھی مٹی کو مردہ باد بھی کہتا ہے۔"(۰۹)

ناول کے اندر منیبہ اور زر جان اس کی محبوب عورتیں ہیں۔ وہ دونوں کو برابر کی عزت اور پیار دیتا ہے۔ عورت کو آٹے کی مانند قرار دیتا ہے۔ اس کو اپنی مرضی کے مطابق تجسیم دے سکتا ہے۔ مگر ملک جو کہ دو عورتوں کی مانند اب الگ الگ حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان کو اپنی مرضی کے مطابق نہ چلا سکتے تھے۔ اس میں وہ اپنے ملک کے عسکری و سیاسی قیادت کو الزام ٹھہراتا ہے۔ مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش کی تخلیق کو وہ اپنے ذہن و اعصاب پر سوار کیے ہوئے ہیں۔ انتہائی اختصار کے ساتھ اس ناول کے اندر ملک پاکستان کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ خاص طور پر مذہبی منافرت پھیلانے میں ناول نگار نے مولوی کے کردار کو عیاں کیا ہے۔ ناول مکمل زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ "مٹی آدم کھاتی ہے" ایک مختصر ناول ضرور ہے، مگر اس ناول کے اندر زندگی کا اظہار بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر راشدہ قاضی اس سلسلہ میں یوں اظہار کرتی ہیں:

"ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایسی صنف ہے، جس میں اجتماعی اور خارجی زندگی کے حقائق کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ یوں تو فنون لطیفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اپنے ماحول اور سماجی عوامل سے بے نیاز رہ سکے۔ مگر ناول حقائق کی جزیات کا مشاہدہ پیش کرتا ہے۔ جن سے ہم ان اسباب و علل کا مکمل تجزیہ کر سکیں۔ اور ان قدروں کے باہمی پیکار کو سمجھ سکیں۔ جن کے نتیجے میں حیات انسانی متنوع انداز میں ہم پر منکشف ہوتی ہے"(۱۰)

۲۰۱۳ء میں بک ٹائم کراچی سے ایک ناول کی اشاعت ہوتی ہے۔ جو کہ بنگالی مصنفہ، ناول نگار عقیلہ سلیم کے لکھے ہوئے ناول Of Martyrs and Marigolds" کا اُردو ترجمہ "لہو لہو بنگلہ دیش" کے عنوان سے ہے۔ بعد میں ۲۰۱۴ء میں "آج" کے کتابی سلسلہ میں آج کے مدیر اجمل کمال اس ناول کا ترجمہ کر کے شائع کرتے ہیں۔ وہ اس کا عنوان "کہانی پھولوں اور شہیدوں" کے عنوان سے شائع کرتے ہیں۔ یہ ناول اپنے انداز میں ایک دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ جس میں ناول نگار نے اپنے کمال فن سے اور یادداشتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اس ناول کے اندر کرداروں کے ڈھاکہ اور اس کے مضافات میں گزارا گیا وقت بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر مغربی پاکستان سے جو بیوروکریٹ جو ہجرت کر کے واپس آتے ہیں یا ان کا خاندان اس سانحے میں اپنی جانوں کا نظرانہ دے دیتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت بنگالی زبان بولنے والے مقامیوں کی اپنی پہچان تھی۔ وہ نئے ملک کے بننے سے خوش تھے۔ مگر اردو زبان بولنے، مغربی پاکستان اور کلمہ کے نام پر رہنے والے اور اردو زبان بولنے والے بنگالیوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ اس ناول کے کردار ثوری، سمیع، اور سعدی انہی اردو زبان بولنے والے بنگالیوں کے عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں ان کو اپنے آپ کو بنگال کی زمین اور لوگوں کے لیے وفادار ثابت کرنے کے لیے بھی کافی مشکلات کا

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بنگالی فوج اور مکتی باہنی کے لوگ ان کا جینا ویسے محال کر دیتے ہیں، جیسے سقوط سے قبل فوجی آپریشن کے ذریعے سے کیا گیا تھا۔ اے خیام اس ناول کے تعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے نظر آتے ہیں:

> "اگر تاریخی سچائی کو سامنے رکھتے ہوئے عقیلہ اسماعیل کے ناول "Of Martyrs and Marigolds" کا مطالعہ کریں تو تاریخی سچائی پوری توانائی کے ساتھ حقیقت نگاری کی مثال بن کر سامنے آتی ہے۔ عقیلہ اسماعیل نے یہ ناول مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھا ہے۔ مشرقی پاکستان کے زوال سے پہلے کی صورتحال، مغربی پاکستان کے تسلط کا بیان، مرکزی حکومت کا رویہ، غیر منطقی سیاسی رویہ بنگالیوں کے جدوجہد کے دوران کی صورتحال اور سب سے بڑھ کر بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کی زہشت انگیز رویے کی داستان "(۱۱)

عقیلہ اسماعیل نے ۱۹۷۱ء میں ہجرت کی۔ وہ کراچی میں درس و تدریس سے وابستہ رہیں۔ مگر ان کو اپنی مٹی سے محبت تھی۔ خاص طور پر وہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہی تھی کہ اردو زبان بولنے والے بنگالیوں کو کس جرم کی سزا دی گئی، ناول کے اہم کرداروں میں سمیع، ثوری اور سعدی ہیں۔ ثوری کا اصل نام ثریا ہے۔ مگر پیار سے اس کو ثوری بلاتے ہیں۔ وہ رومی سے محبت کرتی ہے۔ مگر ان کا پیار ۱۹۷۱ء کے سقوط میں ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی جنم بھومی بنگال کی سرزمین ہے۔ مگر اس صورتحال میں ان کو نکلنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے بھی ایک مجرم کی طرح نکالے جاتے ہیں۔ ان کے اوپر جو جو مظالم بنگلہ دیشی فوج ڈھاتی ہے، اس کی ان کو کوئی توقع ہی نہ تھی۔ ناول سے اقتباس:

> "فروری ۱۹۷۲ء کی صبح ابھی گھاس پر شبنم کے قطرے بھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ ثوری (ثریا) کو میرپور میں اپنے مکان سے بنگلہ دیشی فوجیوں نے نکال باہر کیا۔ ایک کم ۵۰ دن پہلے مشرقی پاکستان جسے ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تخلیق کیا گیا تھا، بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ سنہرا دیس ان لوگوں کے لیے تھا، جن کی مادری زبان بنگالی تھی۔ جب کہ وہ تمام لوگ جن کی مادری زبان بنگالی نہ تھی، ان کا اس سنہری سرزمین پر کسی قسم کا حق نہ تھا۔ فروری کی کہر آلود صبح بھی فضا میں پھیلی شفالی پھولوں کی خوشبو میں اپنے مکان سے نکالی گئی ثوری گھٹنوں میں سر دیے سفید دوپٹہ لپیٹے بیٹھی تھی "(۱۲)

بنگلہ دیشی فوج، مکتی باہنی کے لوگوں کے ظلم و ستم کے علاوہ عقیلہ اسماعیل نے اپنے اس ناول میں ۱۹۷۱ء کے فساد کے پس منظر میں جو پاکستانی فوج کو اختیارات دیے گئے تھے، ان کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں بنگالی فوج اور مکتی باہنی والے افراد اردو بولنے اور ایک متحد پاکستان کے حق دار لوگوں کو دبا رہے تھے، ان سے بدلہ لے رہے تھے۔ اس سے قبل یہ کام پاکستانی فوج کر رہی تھی۔ اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے والے افراد کو زبردستی پابند سلاسل اور مار دینے کے علاوہ وہ لوگ نسل کشی اور عصمت دری بھی کر رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۱ء میں یہ ایک عظیم سانحہ تھا۔ ناول نگار اس حوالے سے بیان کرتی ہے:

> "اس شب تین لاکھ مرد عورتیں اور بچے بحر ہند میں غرق کر دیے گئے۔ پاکستانی جنرلوں کے احکامات کہ تیس لاکھ بنگالی جوانوں کو مار ڈالو۔ بنگالی لبریشن فرنٹ مکتی باہنی کے ہاتھوں چٹاگانگ کی جوٹ مل میں اردو بولنے والی عورتوں کا قتل عام دسمبر کی جنگ سے ایک دن پہلے ڈھاکہ کی تپتی سرزمین پر بنگالی دانشوروں کا قتل، جنگ جو انڈیا جیت گیا، اور پاکستان ہار گیا یہ سب گزرے سال کا حصہ تھا اور جو گزر گیا اسے خدا بھی پلٹ نہیں سکتا ہے۔ "(۱۳)

عقیلہ اسماعیل کے ناول میں جہاں مغربی پاکستان کے لوگوں، سیاستدانوں اور فوجی جرنیلوں کی بات کی گئی ہے۔ ان کے رویوں اور حقائق کو سامنے لایا گیا ہے۔ اردو زبان بولنے والے محب وطن پاکستانیوں کو ان کے جذباتی وابستگی کی بات کی گئی ہے۔ وہیں اس لسانی تعصب کو بھی عیاں

کیا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے لوگ اور خاص طور پر جرنیل کس قدر تذلیل والا انداز مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ ان کو طرح طرح کے القابات دیتے تھے۔ ان کو کالا، بھوکا، ننگا وغیرہ کہہ کر پکارا جاتا شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شیخ مجیب پر جنرل یحییٰ بھروسہ کرنے اور اقتدار منتقل نہ کرنے کے حامی تھے۔ بقول عقیلہ اسماعیل:

"بیوروکریٹ ایسا ہرگز نہ ہونے دیں گے کہ لیگ کو حکومت دے دیں جو ان کا حق ہے۔ وہ ہمیشہ بنگالیوں کو ناشکرا ،لالچی، کالا اور چھوٹے قد کا سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارا ذکر ہمیشہ بھوکے بنگالی کے طور پر کرتے ہیں۔ ہم بھکاری نہیں ہیں بلکہ ہم تو اپنا حق مانگتے ہیں۔"(۱۴)

"لہو لہو بنگلہ دیش" کے اندر جہاں کرداروں کی نفسیاتی اور ہیجانی کشمکش کو ناول نگار نے واضح کیا ہے بلکہ اس نفرت کو بھی کھلم کھلا واضح کیا ہے کہ جس کی وجہ سے حالات اس نہج تک پہنچے ہیں۔ آرمی افسران، سیاستدان، بیوروکریٹس، تمام لوگوں نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوام نے ووٹ کے ذریعے سے اپنا جواب جمع کروایا مگر آنے والے دنوں میں اقتدار کو منتقل کرنے کی بجائے حیل و حجت سے کام لیا جانے لگا۔ عوام کے اندر غم و غصہ اور بے چینی بڑھنے لگی۔ تابوت میں آخری کیل ڈھاکہ میں فوجی دستوں کی آمد اور بنگالی بیوروکریٹس کی تبادلوں نے ٹھونک دی۔ جس سے بنگالیوں میں محبت کی بجائے نفرت وسیع تر ہوتی گئی۔ یہی صورتحال واضح انداز میں ناول نگار جو کہ اس وقت عینی شاہد تھیں، جنہوں نے اپنے ناول کے اندر بیان کی ہے۔ وہ اس وقت کی شہادت کو بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

"جون تک ڈھاکہ کی نیم ویران سڑکوں پر آرمی کے ٹرکوں کی آمد و رفت معمول بن گئی۔ روزانہ ہوائی جہاز شہر میں فوجی دستے اتارنے لگے۔ سڑکوں کے نام تبدیل کرنے کے لیے تمام ہندو نام اور بنگالی قوم پرستوں کے نام ہٹا دیے گئے۔ یہ مشرقی پاکستان کے کلچر کو مٹانے کی کھلی کوشش تھی۔ سپاہیوں نے تلاشی لیتے ہوئے کھلے عام کہنا شروع کر دیا کہ بنگالی مہذب زبان نہیں ہے اور اگر وہ مسلمان کہلانا چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کو اردو سکھائیں۔"(۱۵)

اردو زبان سے نفرت تو ۱۹۴۸ء کے بعد سے بنگالیوں کو ہو گئی تھی۔ مگر ۱۹۷۱ء تک اس میں مزید شدت آ گئی۔ جس کا اظہار ۱۹۷۱ء کے بعد مکتی باہنیوں اور قوم پرستوں نے اردو زبان بولنے والوں سے کیا۔ جس کا شکار ثوری جیسی بنگال سے محبت کرنے والی عورتیں اور ان کا خاندان ہوا ۔ناول کے اندر جہاں عقیلہ اسماعیل نے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی وہیں اردو زبان کے ذریعے سے اس وقت کے لوگوں کی ذہنی عکاسی بھی کی ہے کہ کس طرح سے ثوری اور اس کا خاندان محض اس وجہ سے انتقام کا شکار ہوا کہ وہ بنگالی کی بجائے اردو زبان بولتا تھا۔ اس کے باپ کی تمام عمر کی عزت و قار جاتا رہا اس کا لحاظ نہ کیا گیا، بلکہ اپنے ہی لوگوں نے محض انتقام میں اس کو قتل کر دیا۔ عورتوں کی عزت و آبرو کو تباہ کر دیا گیا۔ اے خیام اس ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عقیلہ اسماعیل کے ناول میں سب کچھ موجود ہے۔ بنگلہ دیش کی موجود حکومت اس سچائی کا سامنا نہیں کر سکی اور کتاب کو وہاں بین کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا ناول ہے۔ جس میں سیاسی حالت کا بیان ہے اور سچی تاریخی صورت حال بھی سامنے آتی ہے۔ مظالم کا بیان پڑھنے والے کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ محض تصور کو بروئے کار لایا گیا ہو۔ عقیلہ اسماعیل کا یہ ناول سچائی، حقیقت اور غیر جانبداری پر مبنی ہے۔"(۱۶)

۲۰۰۸ء میں اردو ادب کے معروف ناول نگار خالد فتح محمد کا ناول "خلیج" منظر عام پر آتا ہے۔ اس ناول میں خالد فتح محمد نے سقوط مشرقی پاکستان اور بنگالی تہذیب و ثقافت کو موضوع بنایا ہے۔ پیشہ وارانہ طور پر وہ آرمی کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ ادبی میدان میں وہ افسانہ اور ناول لکھتے

رہے ہیں۔ ان کا اس ناول کو لکھنے کا مقصد حقائق کو منظر عام پر لانا ہے۔ مگر نقاد اس ناول کو سوانحی کہتے ہیں۔ کیوں کہ ناول کا اندازِ بیان اور پلاٹ بالکل سادہ ہے۔ ایک کردار "افضل" اس ناول میں ہر طرف نظر آتا ہے۔ ناول چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مگر اپنے اندر ایک مکمل کہانی کو سموئے ہوئے ہے۔ اگرچہ انھوں نے تہہ در تہہ واقعات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ فوج کی چھاؤنی سے لے کر مشرقی پاکستان کے علاقے رنگ پور تک اس ناول کا پلاٹ بنایا گیا ہے۔ خاص طور پر افضل اور یاسمین کے درمیان جو جزباتی و نفسیاتی لگاؤ ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ پھر سقوط ڈھاکے بعد افضل جب یاسمین کو رنگ پور میں چھوڑ کر چلا آتا ہے۔ اس کرب ناک منظر کو ناول نگار نے اپنے خاص اسلوب اور فلسفے سے بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار افضل ہے۔ جو کہ ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ ہے مگر محنت کرتے ہوئے وہ فوج میں لیفٹیننٹ کے رینک تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی اس کی طبیعت کے اندر متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے مگر جب وہ مغربی سے مشرقی پاکستان کا سفر کرتا ہے تو ایئر ہوسٹس فاخرہ کے ساتھ اس کی عشقیہ باتوں سے اس کے کردار کا الگ پہلو سامنے آتا ہے۔

یہ ایک مکمل ناول ہے کہ جس میں محنت، جدوجہد، عشق و عاشقی کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے الم ناک سانحے کو جوڑا گیا ہے۔ فوج کی طرف سے بنگالیوں کو احساس محرومی ایک تحفہ دیا گیا۔ ان کو مسلسل اذیت سے دوچار کیا گیا۔ اس کا اظہار خالد فتح محمد کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ناول کے ذریعے سے ناول نگار نے Psycho Analysis کیا ہے۔ چار ابواب میں سے دوسرے باب کے اندر کہانی ایک نئے موڑ کی طرف سفر کرتی ہے۔ جب فوج کی طرف سے باغی گروہوں، خاص کر مکتی باہنیوں کے خلاف آپریشن کا آغاز کرتی ہے۔ خود چونکہ خالد فتح محمد اس کا حصہ تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے اس حوالے سے جو کردار اور واقعات پیش کیے ہیں۔ وہ حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں۔ افضل کے کردار کو عمل، ردِ عمل اور نفسیات کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ مکتی باہنی کے گروہ سے جب جھڑپ ہوتی ہے تو اس وقت افضل نفسیاتی کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اس وقت ایک خاص قسم کی فکری کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے۔ ناول نگار نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "وہ مشرقی پاکستان آنے کے بعد ایک نظری دور سے گزر رہا تھا۔ وہ لوگوں سے باتیں سن رہا تھا۔ ان کے نظریوں کو اپنی سوچ کے پلڑے پر رکھ کر تولتا آیا تھا۔ آج وہ ایک عملی تصادم سے گزرا۔ وہ موت اور زندگی کے درمیان سے گزرا۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان نہ نظر آنے والی لکیر جو دیکھ چکا تھا کہ آدمی سوچ اور فرض کے درمیان کیسے تقسیم ہو جاتا ہے۔"(۱۷)

مشرقی پاکستان کے اس دور میں سب سے بڑا مسئلہ عورت کو بطور ایک جنسی کھلونے کے استعمال کرنا تھا۔ یہی صورت حال اس ناول میں آتی ہے۔ جب کہ عورت کی اس نفسیات کو پیش کیا گیا جب اس کو ایک سے زائد باغی مل کر گدھ کی طرح نوچتے ہیں۔ عورت ریپ کی تکلیف اور جبری تسلط کو کس اذیت سے سہتی ہے اور خاص طور پر جب وہ اپنے مسلمان فوجیوں کی طرف سے ہو۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء میں اس گھاؤ نے گھناؤنے فعل کو خوب سرزد کیا گیا۔ یہاں تک کہ ناول کے کردار مرشد علی خان کی طرف سے دلالی بھی کی گئی جو کہ چھاؤنی میں ان فوجیوں کو بنگالی عورتیں مہیا کرتا تھا۔ عورت کی نفسیات میں ریپ کا خوف بہت بھیانک نتائج سامنے لاتا ہے۔ ناول نگار اس خوف کو بیان کرتے ہیں۔

> "وہ فائر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہوئے جس بھی گھر میں گیا ایسے ہی ہوا۔ ہر عورت گھر سے نکل کر بھاگی۔ گھروں میں چولہے جل رہے تھے۔ افضل کا خیال تھا عورتوں کے دل میں یہ خوف بیٹھ چکا ہے کہ فوجی ان کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ اس لیے وہ جھولے میں پڑے بچے بھی چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔"(۱۸)

یہ وہ متھ (Myth) ہے جس کی طرف خالد فتح محمد نے افضل کے کردار کے ذریعے سے توجہ دلائی ہے کہ ۱۹۷۱ء کے سقوط میں مغربی پاکستان کے فوجیوں نے اپنی مرضی اور جبری طور پر مشرقی پاکستان کی عورتوں کا جنسی استحصال کیا کہ جس کی وجہ سے ان کے دل میں فوجیوں کا نام

آتے ہی خوف کی ایک سنسنی سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ افضل اور یاسمین کے کردار کے درمیان میں یہی ایک خوف تھا جو دونوں کے قریب آنے کا باعث بنتا ہے۔ کیپٹن امین جو کہ مقامی باغی کمانڈر ہوتا ہ، یاسمین اس کی بہن ہے۔ اس کے ساتھ کیپٹن غفار اور کیپٹن جواد بھی ہوتے ہیں۔ مگر پاکستانی فوج کے جوان یاسمین کا ریپ کرتے ہیں۔ افضل اس سب واقعہ کا عینی شاہد ہے۔ وہ جزباتی لگاؤ کا شکار ہوتا ہے اور یاسمین کے قریب ہو جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان عہد وپیمان ہوتے ہیں۔ مگر افضل بھارتی فوج کی آمد کے ساتھ بھاگ جاتا ہے۔ یاسمین بھی ساری صعوبتیں سہنے کے لیے تیار تھی۔ وہ اپنے لوگوں سے افضل کے لیے لڑتی ہے۔ مگر اس کا فائدہ نہ ہوتا ہے۔ کہانی کا یہ حصہ خوبصورت اور طاقتور ہے جہاں محبت اور وطن کی مٹیااور فرض آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ ایک فرض شناس فوجی ہونے کے ناطے افضل وطن کی مٹی اور فرض کے آگے محبت کو قربان کر دیتا ہے۔ اور دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے۔

"میں آؤں گا اور یہ خلیج ہم عبور کریں گے۔ تمہیں آنندی سناؤں گا۔ افضل یاسمین کو دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے کے پاس ٹرک اور جیپ کھڑی تھی۔ اس نے سکول پر آخری نظر ڈالی۔ اسے کہیں دور سے آسمان پر اٹھتی ہوئی گونج سنائی دی پھر آسمان چھوٹے چھوٹے دھبوں سے بھر گیا۔ یہ ہندوستانی فوج کے ہیلی کوپٹر تھے۔"(۱۹)

محبت اپنی جگہ مگر مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان جو فاصلوں کی دوریاں تھیں، اب وہ بڑھ چکی تھیں۔ یہ محبت کی کہانی افضل اور یاسمین کی نہیں بلکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کی عکاسی تھی۔ اپنی نالائقیوں، ناکامیوں اور احساس کا یہ شاخسانہ خلیج کی صورت میں سامنے آیا۔ ایسی خلیج جو کہ آج تک مکمل نہ ہو سکی تھی۔ سیاسی وسماجی اور جنسی استحصال کو خالد فتح محمد نے اپنے ناول میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ خالد فتح محمد کا کردار افضل کے کردار سے واضح ہوتا ہے جس کی وجہ سے ناقدین اس کو آپ بیتی تصور کرتے ہیں۔ افضل کا کردار اس کی فکر اسکی ذہنی و جزباتی وابستگی دراصل خالد فتح محمد کی اپنی سوچ اور فکر کی عکاسی ہے۔ اس حوالے سے خالد اقبال ان الفاظ کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

"مشرقی پاکستان کی اس تحریک کے بارے میں وہ اپنا نقطہ نظر ضرور رکھتے ہونگے۔ اس نے کسی بھی نظریے کو قاری پر ٹھوسنے کی کوشش نہیں کی، باتوں باتوں میں اس کی تربیت کی ہے کہ وہ بھی اس انسانی المیے کو انسانی المیے کے طور پر سمجھیں کہ انسان حالات کے جبر کے ہاتھوں کس قدر مجبور اور لاچار ہوتا ہے۔"(۲۰)

ناول کے کردار زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ افضل اور یاسمین کے کرداروں میں زندگی کی روشنی ملتی ہے۔ جو کہ ظلم وستم کا شکار ہونے کے بعد محبت کے جزبے سے لیس مشرقی پاکستان کے لوگوں کے بارے میں گفتگو لسانی تعصب سے بھرپور ہے۔ خاص طور پر اردو بولنے والے کو تہذیب یافتہ مانا جاتا۔ مگر جو بنگالی بولتا اس کو شوزر سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ فرق تھا جس کی وجہ سے بنگلہ دیش الگ ملک کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

"ڈھاکہ میں آؤں گا" سہیل پرواز کا ناول ہے جو ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا۔ ناول کے اندر وہی کہانی ہے جو کہ ایک عام ناول کے اندر ہوتی ہے۔ ناول میں تاریخی التزام کی بجائے روائتی محبت کی کہانی ہے۔ سہیل پرواز خود اس ادارے کے ساتھ وابستہ رہے، انھوں نے حقائق کو اپنے اس طویل ناول میں پیش کیا۔ فوج کے حوالے سے منفی آراء سقوط ڈھاکہ کے حوالے ملتی ہیں۔ مگر انھوں نے مشفق الاسلام کے کردار سے اس تاثر کو بھی مائل کیا۔ مشفق کا کردار اس ناول کا ایک ایسا کردار ہے جس میں اپنے وطن کے لیے بغیر کسی لسانی، سیاسی، سماجی حوالے سے محبت ہے۔ وہ اگرچہ بنگالی ذات سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کے ضمیر میں اپنے وطن کے لیے محبت کا عنصر ہے۔ روائتی ناولوں کی بجائے جو کہ اس موضوع پر لکھے

گئے اس ناول میں نہ تو اتنا زیادہ سیاست کو چھیڑا گیا ہے اور نہ ہی فوجی آپریشن پر بحث کی گئی ہے بلکہ صرف اور صرف حقائق سے پردہ چاک کیا گیا۔ غیر متنازعہ کرداروں اور مکالموں سے اجتناب برتا گیا ہے۔ سہیل پرواز اس حوالے سے بیان کرتے نظر آتے ہیں:

"جس ناول میں نہ تو سیاست کی جزیات کو چھیڑا گیا ہے اور نہ ہی فوجی آپریشن پر بحث کی گئی ہے اس میں صرف اور صرف حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔ ایک بنگالی کی کہانی جو کہ اتنا ہی محبِ وطن ہو سکتا ہے جتنا کہ پنجابی، پشتون، سندھی یا بلوچ ہو سکتا ہے۔"(۲۱)

ناول کا کردار مشفق الاسلام احسن کردار میں جو کہ ملٹری اکیڈمی سے تربیت کرنے کے لیے مغربی پاکستان آتا ہے وہ سقوط کے بعد واپس جانے کی بجائے مغربی پاکستان میں رہنا پسند کرتا ہے۔ کئی بنگالی افسران ایسے تھے جنھوں نے نہ صرف اتحاد کے لیے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں بلکہ یہاں رہنے کو ترجیح دی۔ مشفق الاسلام بھی انہی کی طرح تھا وہ اپنی جنم بھومی کو صرف اس وجہ سے چھوڑ دیتا ہے کہ ایک سچا محبِ وطن ہے۔ اس ناول کی کہانی بھی اپنے اندر تین موضوعات لیے ہوئے ہیں۔ وطن سے محبت، ذات سے محبت اور ناقابلِ یقین عزم و استقامت اس ناول کو پڑھنے کے بعد سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ملنے والے واقعات اور حالات سامنے آتے ہیں۔ مگر وہ صرف اور صرف شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس ناول کے دیگر کرداروں میں ماہرہ کا کردار مضبوط اور مثبت ہے۔ دیگر سیاسی کرداروں کو حتمی کرداروں کی ذیل میں بیان کر سکتے ہیں۔

فوجی اور خاص طور پر بنگال سے تعلق رکھنے والے اپنے خطہ کے لیے اور الگ ملک کے لیے کافی زیادہ پرجوش تھے مگر مشفق اس حق میں نہ تھا وہ اس تقسیم کو عارضی سمجھ رہا تھا اور اسلامی ملک کے دوبارہ اتحاد کے لیے کافی پرامید بھی تھا اس کو مکتی باہنی میں اور آزاد بنگلہ فوج میں تھی۔ شاندار عہدے کی پیش کش تھی مگر وہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ اپنے بنگالی ہونے کی بجائے پاکستانی ہونے پر فخر کرتا ہے۔

"سر مجھے تابناک مستقبل نہیں آزاد اور خود مختار پاکستان چاہیے۔ میرے ہیرو ٹیپو سلطان شہید ہیں۔ میر حضور اور میر صادق نہیں اور میں عزت کے ایک دن کو بے غیرتی کے سو سالوں پر ترجیح دوں گا۔"(۲۲)

یہی وہ وفاداری اور حبِ وطن ہے جس کی وجہ سے وہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش میں دیگر فوجیوں کے ساتھ قید ہو جاتا ہے۔ مائرہ سے اس کی خط و کتابت اس سانحہ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ سب لوگ اسے مُردہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے دیگر ساتھیوں نے کیپٹن اسد، سپاہی عاشق بھی شامل ہوتے ہیں۔ مگر ان کا بھی کہیں اتا پتا نہیں ہوتا ہے۔ جی۔ایچ۔ کیو ان کے بارے میں کافی فکر مند ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مشفق کی بیوی مائرہ سے بھی خط و کتابت جاری رہتی ہے۔ کہانی کا انجام شاندار ہے مشفق بنگلہ دیش بننے کے بعد اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نکلنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ وہاں سے برما اور پھر وہاں سے پاکستان آتا ہے۔ حکومتِ پاکستان اس کو ستارہ جرات سے نوازتی ہے۔ ساتھ ہی اس کو بنگلہ دیش میں اپنا ہائی کمیشنر بنا دیا جاتا ہے۔ روایتی کہانیوں سے ہٹ کر اس ناول کے اندر سادہ سی کہانی بیان کی گئی ہے۔ حالات و واقعات، مشکلات اور کرداروں کے اوپر بیتنے والے واقعات کا خوب تذکرہ کیا گیا ہے۔ مشفق جب سفیر بن کر بنگلہ دیش جاتا ہے تو وہ اپنی جنم گھومی اور دیگر رشتہ داروں سے بھی ملتا ہے۔ یوں ڈھاکہ کے ساتھ کیا گیا وعدہ کہ میں آؤں گا، وہ تکمیل پذیر ہو جاتا ہے۔

"نیل کھیت" کیپٹن ریٹائرڈ بشیر احمد خان کا حال ہی میں شائع ہونے والا ناول ہے۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے سے عین پہلے کی ڈھاکہ یونیورسٹی اور ۱۹۷۱ء کی مشرقی پاکستان میں لڑی جانے والی جنگ کے پسِ منظر میں لکھا ہوا ناول ہے۔ ان کا تعلق اگرچہ فوج سے تھا تو اس وجہ سے وہ اس وقت مشرقی پاکستان میں موجود تھے اور حقائق کو کسی کی زبان سے سننے اور کتابوں میں پڑھنے کی بجائے عینی شاہد تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے درست واقعات کو بیان کیا ہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد جتنے بھی اردو ناول لکھے گئے یا اس موضوع پر دوسری زبانوں سے اس کے تراجم کیے

گئے ان تمام ناولوں کے اندر ناول نگاروں کا فنی و فکر کا شعور کمال ہے۔ بے جا کی الزام تراشیاں نہیں بلکہ حقائق کو غیر جانب درردی سے بیان کیا گیا ہے۔

" نیل کھیت " بھی انہی ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ عاویز کا کردار ایک ایسے علاقے سے لیا گیا ہے جو کہ خود احساسِ محرومی اور تقسیمِ ہندوستان سے بھی کم تر سمجھا جاتا ہے۔ سرائیکی خطہ اور اس کی تہذیب و ثقافت بنگال کی طرح شاندار روایات کی حامل ہے۔ مگر یہاں بھی احساسِ محرومی اور حقوق کو سلب کیا گیا ہے۔ عاویز اور اس کا جاگیر دار والد فیوڈل ازم (Feudalism) کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں زمین دار اور جاگیر دار ہیں۔ عام لوگوں کے لیے مائی باپ ہیں، ان کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ناول کے آغاز میں ان کی جاہ حشمت کا نمونہ ناول نگار نے دکھایا ہے جب وہ ہندو، کمی کمینوں کے فیصلے کر رہے ہوتے ہیں۔ عاویز کو کہیں بھی کسی بھی ادارے میں داخلہ مل سکتا تھا مگر وہ ایک الفت، آس اور نئی دنیا کی تسخیر کے لیے مشرقی پاکستان کی ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی ضد کرتا ہے جسے وہ اپنے باپ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود جانے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے نشیبی علاقوں کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے کہ ان علاقوں کی ثقافتی پہنچان واضح ہوتی ہے۔

> " چھل جھوک نامی گاؤں جس اونچے ٹیلے پر آباد ہے یہ دریائے سندھ کے جنوب میں لگ بھگ پینتیس، چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن کبھی کبھار اس ٹیلے کے آس پاس چھل آجاتی ہے۔ " جھوک " کا مطلب بستی ہے اور جب چند لوگ اس ٹیلے پر گھر بنا کر آباد ہوگئے تو اس کا نام " چھل جھوک " پڑ گیا۔ اس بڑے ٹیلے پر زیادہ تر مقامی لوگ آباد تھے جو برسوں سے یہاں رہتے تھے۔ "(۲۳)

اس علاقے کے لوگ اپنے ثقافتی حصار میں قید تھے جس کی وجہ سے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر، مگر عاویز کے والد جاگیر دار اور باہر سے پڑھے ہوئے تھے۔ جس وجہ سے اپنے بیٹے کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوانے کے حق میں تھے۔ عاویز ان کے سمجھانے کے باوجود ڈھاکہ تعلیم حاصل کرنے گیا۔ حالانکہ وہ مغربی پاکستان اعلیٰ سے اعلیٰ ادارے میں داخلہ لے سکتا تھا مگر ڈھاکہ آنے کے بعد اس کی مشکلات میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے جب اس کو داخلہ نہیں ملتا۔ تب ناول نگار سلینا چوہدری کے کردار کو ناول کے صفحات پر لاتے ہیں۔ اس کی پرکشش اور خوبصورت شخصیت سے ناول کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ وہ صاف ستھری اور خوب صورت لہجے میں بولنے پر قادر ہے اور اس کا خاندان ڈھاکہ میں ایک رعب دار اور مقام و مرتبہ والا ہے جن کی سفارش سے اس کو داخلہ مل جاتا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں عاویز کو اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ کی پیشن گوئی اور تحفضات جائز تھے۔ کیوں کہ مشرقی اور مغربی حصے میں سیاسی، معاشی، نظریاتی، لسانی تناؤ اب شدت اختیار کر گیا ہے۔ ناول میں اردو زبان سے بنگالی طلبہ کی نفرت کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے:

> "بنگالیوں کی اکثریت اردو سمجھنے کے باوجود اردو بولنا اور سننا پسند نہیں کرتی ہے اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ عوامی سٹوڈنٹس لیگ کے طلباء کے دلوں میں مغربی پاکستانی نوجوانوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ "(۲۴)

اس سب کے علاوہ جب مغربی پاکستان سے آیا یہ نوجوان اچھے اور عمدہ کراچی سے لائے گئے کپڑے زیب تن کر کے اور اعلیٰ امپورٹڈ چشمے اور بوٹ پہن کر ڈھاکہ یونیورسٹی جاتا ہے تو اس کو نفرت بھری نگاہوں سے وہاں کے مقامی طلباء خوش آمدید کہتے ہیں۔ مغربی پاکستان سے ان کی نفرت بنگالی زبان و معاشرت کو اچھوت قرار دینا، ان کی تہذیب و ثقافت کو گھٹیا کہنا جب کہ بہاریوں سے ان لوگوں کی نفرت اردو زبان بولنا اور مقامی بنگالیوں کی نسبت جلد خوشحال ہو کر اپنی علیحدہ شناخت بر قرار رکھتے ہوئے مغربی پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھنا تھا۔ مغربی پاکستان ان کے وسائل، معدنیات، پیداوار پر قابض تھا۔ اس کے بدلے میں ان کو ان کے جائز حقوق دینے سے انکاری یہاں تک کہ شودر سے بھی کم سمجھا جاتا ان

کو بھوکا بنگالی جیسے نسل پرستانہ رویہ کا سامنا کرنا پڑتا، رہی سہی کسر تعینات فوجیوں کی بٹالین نے پوری کر دی۔ مقامی بنگالیوں کا بہاریوں کے ساتھ روا کیے جانے والے رویے کے بارے میں ناول نگار لکھتے ہیں:

"آخر ایک دن مقامی بنگالیوں کے دلوں میں بہاریوں کے خلاف نفرت کی سلگتی چنگاری موقع پاتے ہیں اپنے خوف ناک شعلوں کے ساتھ بھڑک اُٹھی اور بہاریوں کو خاکستر کر دیا۔ فقط "کلمہ گو" ہونا بہاریوں کے کام نہ آسکا کیوں کہ وہ "بنگالی" مسلمان ہی تھے۔ "بہاری" مسلمان تھے اس لیے تاریک راہوں میں مارے گئے۔ "(۲۵)

بنگال سے عاویز کی محبت اس سڑک کی وجہ سے جسے نیل کھیت روڈ کہتے ہیں۔ اس کا ناول نگار نے تاریخی اور خوبصورت جواز پیش کیا ہے۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"ڈھاکہ میں ایک چھوٹی سی من موہنی سڑک ہے اسے نیل کھیت روڈ کہتے ہیں۔ دونوں جانب سے شاید شیر شاہ سوری کے زمانے کے سایہ دار درختوں سے گھری ہوئی دو بڑی سڑکوں کو ملاتی ہے۔ سنا ہے ماضی میں یہاں نیل کے پودوں کے کھیت ہوا کرتے تھے تو ان کی یاد میں یہ علاقہ نیل کھیت کہلاتا ہے۔ گم گشتہ خوبصورت ماضی، خوبصورت درختوں میں گھری اور خوبصورت نام والی اس تمام کی تمام سڑک کے دونوں اطراف ڈھاکہ یونیورسٹی واقع ہے۔"(۲۶)

ناول کے اندر مغربی، مشرقی پاکستان میں جاری کشمکش اور خاص طور پر بنگلہ دیش میں اردو زبان بولنے والے مہاجر بہاریوں پر قیامت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک مکمل ناول ہے اگرچہ اس سے قبل بھی اردو میں ناول لکھے گئے مگر ایک مکمل ناول اکیسویں صدی میں اس موضوع پر تحریر کیا گیا۔ ڈاکٹر شعیب عتیق خان اس ناول کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

"ناول نگار کی مشرقی پاکستان کے ساتھ والہانہ محبت کو دیکھیں کہ ناول کی پوری کہانی، کہانی کا ہر قردار، ہر واقع استعارہ ہے۔ اگر عاویز خود مغربی پاکستان کا استعارہ ہے تو سلینا چوہدری مشرقی پاکستان کا استعارہ ہے۔ اس طرح سیٹھ مہندرہ باسو بھارت کا استعارہ ہے۔ سلینا کا اغوا ہونے کے بعد سیٹھ مہندرہ باسو کے ہاتھوں میں چلے جانا دراصل مشرقی پاکستان کا استعارہ ہے۔ اس کی بازیابی دراصل بنگلہ دیش کی بھارت سے عارضی بازیابی ہے۔ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی حالات کے جبر کا شکار ہو چکے ہیں۔"(۲۷)

۲۰۰۰ء کے بعد شائع ہونے والے اردو ناولوں کے اندر ناول نگاروں کے ہاں شعور کی پختگی اور تاریخ سے آگاہی ان کے فن کو مکمل کرتی ہے۔ تارڑ سے لے کر کیپٹن بشیر احمد کے ناول نیل کھیت تک متعدد ایسے ناول سامنے آئے کہ جن میں ناول نگاروں نے ان دو حصوں کے بارے میں حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ روائتی حقائق کی نسبت ان کے ناولوں کے اندر نفسیاتی، تاریخی، جغرافیائی حقائق کو سامنے لایا ہے۔ اردو زبان بولنے والے بہاریوں سے لے کر محبِ وطن بنگالیوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ جنھوں نے جبر کو نہ مانتے ہوئے ظالم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔ الغرض تمام ناولوں کے اندر قاری چشم کشا حقائق و واقعات سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس سانحے کو ناول میں جگہ دینے یا ملنے سے قاری کے شعور میں اضافہ ہوا ہے۔ لسانی تعصب سے لے کر دشمن کا آلہ کار بننے تک کے حقائق کو ناول کے موضوعات میں جگہ دی گئی ہے۔

**حوالہ جات**


۱. رفاقت حیات، پاکستان میں اردو ناول، (اسلام اباد: اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۲۲ء)، ص ۲۲

۲. سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، (کراچی: انجمن اردو، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۳۴

۳. حسرت کاسنگجوی، ناول کے جدید انقلابی اوراق، مشمولہ: خیابان، (پشاور: شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء)، ص ۲

۴. محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، (اسلام آباد، یورپ اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۷۹

۵. محمد سفیر اعوان، خس و خاشاک زمانے: ایک تجزیہ، مشمولہ: معیار، (اسلام آباد: شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر 2012ء)، شمارہ ۸۰، ص ۳۹۸

۶. مستنصر حسین تارڑ، مجموعہ مستنصر حسین تارڑ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۸۵

۷. ایضاً، ص ۲۶۶

۸. ایضاً، ص ۲۷۸

۹. حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، (کراچی: اکادمی، بازیافت، ۲۰۰۷ء)، ص ۷۷

۱۰. راشدہ قاضی، سقوطِ مشرقی پاکستان اور اُردو ناول، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۴ء)، ص ۴۸

۱۱. عقیلہ اسماعیل، لہو لہو بنگلہ دیش، (کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۳ء)، مترجم قیصر سلیم، ص ۱۲

۱۲. ایضاً، ص ۱۶

۱۳. ایضاً، ص ۱۷

۱۴. ایضاً، ص ۹۸

۱۵. ایضاً، ص ۱۵۶

۱۶. اے خیام، زوال مشرقی پاکستان پر ایک خون رنگ ناول، مشمولہ: لہو لہو بنگلہ دیش، ص ۱۱

۱۷. فتح محمد، خالد، خلیج، (لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۷

۱۸. ایضاً، ص ۷۷

۱۹. ایضاً، ص ۱۸۷

۲۰. عطاالرحمن میو، خالد محمد کی ناول نگاری، مشمولہ: نور تحقیق، (لاہور: شعبہ اردو، گیریژن یونیورسٹی، )، جلد ۳، شمارہ ۱۱، ص ۲۴۲

۲۱. سہیل پرواز، ڈھاکہ میں آؤں گا، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۱ء)، ص ۷

۲۲. ایضاً، ص ۳۰۷

۲۳. بشیر احمد خان عباسی، کیپٹن، نیل کھیت، (لاہور: قلم فاؤنڈیشن، ۲۰۲۴ء)، ص ۲۲

۲۴. ایضاً، ص ۵۶

۲۵. ایضاً، ص ۱۷

۲۶. ایضاً، ص ۹۵

۲۷. شعیب عتیق خان، تاثرات: نیل کھیت، ایک تعارف، مشمولہ: نیل کھیت، از: کیپٹن بشیر احمد خان، ص ۱۰